© rasailojaraid.com

ترکی آزمائش کی گھڑی میں (۱۷)

اینڈریو جے اے مینگو

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مغرب نے بالعموم اور امریکہ نے بالخصوص ترکی میں جمہوری عمل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ترکی نے اس کا جواب ۱۹۵۰ء سے باقاعدگی سے آزادانہ پارلیمانی انتخابات کے انعقاد کی صورت میں دیا ہے۔ اسی طرح فوج نے منتخب حکومتوں کی پھیلائی ہوئی معاشرتی بدنظمی کی بحالی کے لیے ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۰ء میں مداخلت کی۔ جنرل بالآخر اقتدار سے دستبردار ہو کر ذرا فاصلے پر جا کھڑے ہوتے رہے اور اقتدار دوبارہ جمہوری لحاظ سے منتخب حکومتوں کو لوٹایا جاتا رہا۔ کمیونزم کے زوال کے بعد جمہوریت نے عالمی عقیدے کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ترک فوجی سربراہوں کو احساس ہوا کہ اندرون ملک بگاڑ کی اصلاح کے لیے سرد جنگ کے دور کی ان کی مداخلت کے رجحان کا اثر محدود رہا۔ اس سے انہیں اب باز رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک معروف اسلام پسند جمہوری طریقے سے منتخب مخلوط حکومت کے وزیر اعظم کے طور پر اقتدار پر فائز ہو گیا۔

مغرب اپنے ہی ہاتھ کی صناعی کو دیکھ کر اس سے مایوسی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنے بعض ترک اتحادیوں کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے، جو جائز یا ناجائز کسی بھی ذریعہ سے موجودہ حکومت سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام پسند راہنما نجم الدین اربکان کے اعلان کہ کمال اتاترک نے ریاست کی جمہوری اور سیکولر حیثیت کے لیے جو اصول واضح کیے تھے، وہ ان کی مخلوط حکومت کی مشترک بنیاد ہیں، کے بارے میں محض اس دلیل کی بنا پر شک کی گنجائش نہیں کیا جا سکتا کہ اربکان میں مغرب سے اخذ کردہ اصولوں سے پیچھا چھڑانے کی طاقت نہیں ہے۔

جماعتی تسلسل اور تنازعہ

ترکی کی تمام سیاسی جماعتیں بنیادی طور پر سرپرستی اور محافظت کا جال ہیں۔ تمام جماعتوں کے مقاصد میں مفادات کو اپنے حامیوں کے حق میں استعمال کرنے کا ہدف شامل ہے۔ تمام جماعتیں ریاست کے نفع بخش ٹھیکوں کے حصول کی کوشش کرتی ہیں۔ اس حوالے سے اسلامسٹ اپنے سیکولر مخالفوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اربکان ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پہلے ایجوت اور پھر دیمرل کی مخلوط حکومت میں جونیئر حلیف رہے۔ وہ ان میں سے کسی بھی اتحاد سے رضاکارانہ دستبردار نہیں ہوئے۔ اربکان ۱۹۸۰ء کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہائی میں اپنے سابق سرپرست ترگت اوزال کے ہاتھوں اپنے بہت سے حامیوں سے محروم ہوئے۔ تاہم جب اوزال کی مدر لینڈ پارٹی کمزور پڑ گئی، تو ان کی نظریں دوبارہ حکومت میں شمولیت پر مرکوز ہو گئیں۔ جون ۱۹۹۶ء میں جیسے ہی یلماز کا چیلر کے ساتھ اتحاد ختم ہوا، تو اربکان کا تبصرہ تھا کہ یلماز اقتدار سے چمٹے رہنے کے لیے کچھ زیادہ ہی احمق واقع ہوا ہے۔ اربکان اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اب خود تانسو چیلر کے ساتھ مخلوط حکومت کی تشکیل کا مقصد اربکان کے پیش نظر محض اقتدار میں رہنا ہے۔ تاکہ وہ اپنے اور اپنے حامیوں کے مفادات کی تکمیل کر سکیں۔ لیکن اس کے لیے انہیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں ووٹ دہندگان کی اکثریت کو ثمرات سے زیادہ فیض یاب کر سکتے ہیں۔ اسلام پسندوں کی زیر سرکردگی حکومت انقلابی حکومت نہیں ہے۔ اربکان کے الفاظ میں ان کے پیش نظر مقصد "دینا ہے لینا نہیں"۔ یہ سیاسی کیمیا گروں کا سدا بہار منصوبہ ہے۔

پارلیمنٹ میں موجود پانچوں سیاسی جماعتیں موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کا حصہ ہیں۔ لیکن ان کے مباحث میں اختلاف ان کے حلقہ ہائے انتخاب کے مابین ثقافت اور حیثیت کے اختلاف کی نمائندگی کرتا ہے۔ سیکولر پارٹیاں نسبتاً" متمول مغربی ساحلی علاقوں میں مضبوط ہیں۔ جہاں بلقان کے پناہ گزینوں کی نسلوں کا جمگھٹا ہے اور ان میں یورپی اثر و نفوذ عام ہے۔ ان جماعتوں میں موضوع بحث معیشت ہے۔ ان میں دو دائیں بازو کی معتدل جماعتیں آزاد معیشت کے فوائد پر زور دیتی ہیں، جبکہ ان کی مخالف بائیں بازو کی معتدل جماعتیں پبلک سیکٹر اور اس کے متوسلین کا دفاع کرتی ہیں۔ نادار مرکزی علاقوں میں، جہاں اسلام پسند حزب رفاہ سب سے زیادہ مضبوط ہے، پرانے طرز زندگی کی گفتگو چلتی ہے۔ جیسے خوشحالی نیکی کا انعام ہے اور نیکی اسلام پر عملدرآمد میں مضمر ہے۔ وغیرہ

مذکورہ رجحانات سے نمایاں استثنے غیر مقلد شیعوں کی علوی برادری ہے، جن کا گڑھ مرکزی اناطولیہ ہے۔ یہ مقابلتاً" غربت کے ماحول میں رہتے ہیں اور کام کے لیے اپنے افراد شہری علاقوں میں ماہی گیروں کی بستیوں میں بھیجتے ہیں۔ علوی حضرات سنی اکثریت کے جبر سے تحفظ کے لیے سیکولر ازم کی بقا پر انحصار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ بائیں بازو کے معتدل افراد کی حمایت کرتے ہیں۔ یا نوجوان انتہا پسندوں کی صورت میں انتہا درجے کے بائیں بازو کی، جو ان کی نظروں میں لادینیت اور ریاستی امداد کے سب سے بڑے چیمپئن ہیں۔

ترک قوم پرستی سوائے باشعور کردوں کے سب کو ایک مضبوط نظریہ فراہم کرتی ہے۔ تاہم قوم پرستی کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ اس میں اتاترک کا خارجی نسخہ ہے، جو دنیا کے ساتھ برابری کی سطح پر معاملات طے کرنے کو تیار ہے۔ دوسری طرف گریز پائی کا داخلی پہلو، جو غیر ملکی سازشوں کے نقوش ہر جگہ دیکھتا ہے۔ اتاترک سازشوں کی تھیوری میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر سے جمہوریہ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لاحق سب سے بڑا خطرہ داخلی جہالت سے ہے نہ کہ خارجی دشمنوں سے۔ اگر حالیہ سالوں میں ترکی میں سازشی مفروضات نے جڑیں پھیلائی ہیں، تو اس کی کم از کم ایک وجہ دوسروں پر انحصاری کا کلچر ہے، جو ملک کی جغرافیائی اور حربی موقف کی بنیاد پر منافع کی تلاش میں پروان چڑھا ہے۔

ترکی میں سیاسی بحث و مباحثے میں تندی و تیزی کی متعدد وجوہ ہیں، جو (اس تحریر کے لکھنے کے وقت تک) کسی متوقع بحران کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ رائے دہندگان میں سے ایک محروم طبقے کا ابھر کر اقتدار پر پہنچنا اور اس کے معاشی نتیجے کے طور پر ان عناصر کی طرف سے سرپرستی سے اجتناب ہے، جو اس کے عرصے سے عادی چلے آ رہے ہیں۔ پھر اس کا ثقافتی شعبہ ہے، جس میں آبادی کی ایک بڑی اکثریت اور اس کی تمام تر اشرافیہ اپنے طرز زندگی کے لیے خطرہ محسوس کرتی ہے۔

تاہم اس خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسلامی حزب رفاہ کو موجودہ حاصل کردہ ۲۱ فیصد رائے دہندگان کی حمایت کو اکثریت میں بدلنے میں ایک طویل سفر درکار ہے۔ اسے یہ حمایت پکے بنیاد پرستوں سے نہیں، بلکہ احتجاجی ووٹروں سے حاصل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر شہر کے غربا اتنے بڑے پیانے پر مذہبی نہیں بن سکتے، لیکن انہوں نے اپنی وفاداری سوشل ڈیموکریٹس سے تبدیل کر کے اسلام پسندوں سے وابستہ کر لی ہے۔ مسلح افواج، بیوروکریسی کے اعلیٰ عہدے داران اور تاجر برادری اتاترک کے اصولوں کی حامی ہے۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ اور یونیورسٹیاں اتاترک کے حامیوں کے قبضے میں ہیں۔ لادین حلقوں کو اس امر کا خوف ہے کہ کہیں اسلام پسند ان اداروں میں نفوذ نہ کر جائیں۔ بلاشبہ یہ خدشہ موجود ہے، لیکن اس کے خلاف مزاحمت بھی بہت مضبوط ہے۔ اربکان کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی مسلح افواج نے اپنی صفوں میں سے بنیاد پرستوں کو نکالنے کا عمل جاری رکھا ہے۔

اربکان نے ہر معاملے بالخصوص خارجہ پالیسی کے سلسلے میں مسلح افواج کی رائے کا لحاظ رکھا ہے۔ انہوں نے قومی سلامتی کی کونسل کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے اتحادیوں کے جہازوں کو شمالی عراق کی فضاؤں میں گشت کی اجازت کے معاہدے میں توسیع کر دی۔ انہوں نے اسرائیل کے ساتھ دفاعی تربیت اور اسلحے کے حصول کے سلسلے میں جنرل سٹاف کی خواہش کا احترام کیا۔ وہ اگست ۱۹۹۶ء میں ایران کے دورے میں اپنے ساتھ تین جرنیلوں کو لے گئے۔

اربکان کے ان تمام اقدامات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد اسلامی انقلاب نہیں، جسے وہ برپا کرنے کی امید نہیں رکھتے، بلکہ اپنی سیاسی بقا ہے۔ انقلاب کی بجائے وہ کچھ علاماتی شعائر پر اکتفا کریں گے۔ ان میں استنبول کے جدید مرکز میں مسجد کی تعمیر ہے۔ جمعہ کی نماز کے لیے سرکاری طور پر وقفہ اور غالباً" مسلمانوں کو آیا صوفیہ میں نماز پڑھنے کی اجازت دینا شامل ہے۔ آیا صوفیہ بازنطینی دور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں چرچ تھا' جسے مسلمانوں نے استنبول فتح کرنے کے بعد مسجد میں تبدیل کر دیا تھا اور جسے اتاترک نے بعد میں میوزیم میں ڈھال دیا۔ یہ علاماتی اقدامات اسلام پسندوں کو پریشان ضرور کریں گے' لیکن وہ ان کے طرز زندگی کو متاثر نہیں کر پائیں گے۔ اس عرصے میں منظم طور پر سیکولر بنانے کا عمل عالمگیر صارفانہ رجحان اور طرز زندگی کی بدولت جاری رہے گا۔ اتحاد اور عوامی اخلاقیات کی خلاف ورزی کے خلاف موجودہ قوانین' جو بنیادی طور پر "ضابطہ نپولین" سے اخذ کردہ ہیں' باعث نزاع بن رہے ہیں۔ تاہم ترکی میں آزادیوں بالخصوص فنون لطیفہ کی آزادی کے خلاف بدنیتی پر مبنی غیر موثر مداخلت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا نقصان دہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ تخلیق کی راہ میں رکاوٹوں اور پابندیوں سے اس میں تیزی آتی ہے۔

معیشت

جمہوریت اور غیر ملکی امداد نے ترکی کو بلاشبہ فوائد سے مستفیض کیا ہے۔ اس سے آبادی میں اضافے کے تناسب کی نسبت معیار زندگی میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ ۶ کروڑ ترک (اور کرد) عوام ۱۹۵۰ء میں ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ اور ۱۹۲۳ء میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی کے مقابلے میں کہیں زیادہ لمبی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ جمہوریت اور غیر ملکی امداد کے باعث اہل ترکی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کی روش پر گامزن ہیں۔ چنانچہ آمدنی اور خرچ میں عدم توازن کے باعث ترکی متواتر بحرانوں کا شکار رہا ہے۔ اس کا نتیجہ بدانتظامی کی ابتر صورت حال ہے' جس میں اصلاح کے فقدان کے باعث کوئی بھی غیر ملکی امداد یا قرضہ بحران کو حل کرنے میں مدد نہیں دے سکتا۔

اس وقت ترکی کی قومی پیداوار کی شرح جو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ۶٫۳ فیصد تھی' ۱۹۹۳ء تک گھٹ کر ۵٫۳ فیصد سالانہ رہ گئی۔ جب تک وسائل کو دانشمندی سے استعمال میں نہیں لایا جاتا' شرح پیداوار میں مزید کمی ہو گی۔ ۱۹۹۵ء میں ریاستی بجٹ کا صرف ۶ فیصد سرمایہ کاری پر جبکہ ۳۳ فیصد قرضوں پر خرچ ہوا۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کے اواخر تک ترکی پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ۷۳ ارب ڈالر تھا۔ غیر ملکی تجارت میں خسارہ جو ۱۹۹۵ء میں ۱۳ ارب ڈالر تھا' ۱۹۹۶ء میں دگنا متوقع تھا۔ اس سلسلے میں اندرونی قرضوں کا حجم ۲۳ ارب ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ جولائی ۱۹۹۶ء کے آخر تک قیمتیں خوردہ فروشی میں ۸۱ فیصد' جبکہ تھوک میں ۷۶ فیصد سالانہ کے تناسب سے بڑھ رہی تھیں۔

اربکان کو ملکی معیشت کی خرابی کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا' جو انہیں جون ۱۹۹۶ء کے آخر میں ورثے میں ملی۔ لیکن چونکہ اندرون اور بیرون ملک تاجر برادری ان کے پیش روؤں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقابلے میں ان پر کم اعتماد کرتی ہے' ان کے لیے زیادہ مشکل ہو گا کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اقتصادی بدنظمی کو درست کرنے میں کامیاب ہو سکیں اور اسلام پسندوں کی زیر سرکردگی اتحادی حکومت کو فوری خطرہ معیشت ہی کی طرف سے لاحق ہے۔

کردوں کا مسئلہ

ترکی کے جنوبی مشرقی حصے میں کردوں کی بغاوت کی وجہ سے بھی ملک کی اقتصادی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ اس مسئلے کے سلسلے میں بھی اربکان تذبذب کا شکار ہیں۔ داخلی قوتوں اور شخصیتوں پر مشتمل طاقتور اتحاد انقلابی کرد ورکرپارٹی اور انتہا پسند بائیں بازو کے کردوں اور ترک گروپوں کو جو تشدد پر عمل پیرا ہیں' کو شکست دینے پر مصر ہے۔ اتحاد میں مسلح افواج' صدر سلیمان ڈیمرل' بلندا یجوت جیسے بائیں بازو کے قوم پرست' دائیں بازو کے قوم پرست اور نیشنل ایکشن پارٹی کے سربراہ الپسلان ترک شامل ہیں۔ ترک تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ میں اقلیتوں میں قوم پرستی کا عروج غیر ملکی اکساہٹ کے عمل کی پیداوار تھا۔ اس بنا پر بہت سے ترکوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ کرد ورکرز پارٹی کے خطرے کو بیرونی حکومتوں کی طرف سے انگیخت مل رہی ہے۔ ان بیرونی حکومتوں میں ذرا کم درجے پر ایران' یونان اور یونانی قبرصی شامل ہیں۔

اسی طرح ترک روس کے بعض حلقوں کو بھی مداخلت کے لیے مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ انھیں مغربی یورپ کے ملکوں اور امریکہ کے بارے میں بھی شک ہے کہ وہ چاہے کردوں کی ڈھکے چھپے حوصلہ افزائی نہیں بھی کرتے' لیکن ان کی رضا مندی ان کی جدوجہد میں شامل ہے۔ امریکہ جو بظاہر اس کے برعکس بیان دیتا ہے' ترکوں کی نظر میں ایک آزاد کردستان کی تحریک اس کے پالیسی پلان میں موجود ہے اور وہ کردوں کو ترکی' ایران یا عربوں کے خلاف جہاں ضرورت ہو' دباؤ ڈالنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

کرد باغیوں کے خلاف ترک افواج کی گذشتہ ۱۲ سالہ مہم کے نتیجے میں بظاہر شہروں کو تحفظ حاصل ہوا ہے' لیکن دیہی علاقوں پر اس کا کم ہی اثر پڑا ہے۔ اس سے ترک معیشت پر بہت بھاری بوجھ لدا ہے۔ اس سے بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ ترکی کے نسلی مخالفوں کے ہاتھوں میں بطور ہتھیار آیا ہے۔ روایتی کرد معززین جن میں سے بہت سے مذہبی بھائی چارے کے موروثی مبلغ ہیں' کو اربکان کی ویلفیئر پارٹی میں نمائندگی دی گئی ہے۔ لیکن اربکان ہنگامی حالت کو ختم نہیں کر سکتے اور مسلح افواج کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں بھی نہیں لے سکتے۔ اگرچہ ان کے ایسے اقدامات کو ان کے کرد حمایتیوں کی تائید حاصل ہوتی۔ بہرحال اربکان کی طرف سے' جو ترکوں اور کردوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی نظریے کی بنیاد پر مسئلے کے حل کا کم ہی امکان ہے' ویسے ہی جیسے کہ سیکولر طبقے اسے ایک جمہوری نظام میں مشترکہ شہریت کے رشتے سے اسے حل کرنا چاہتے ہیں۔

مغرب ترکی کے کرد مسئلے کو حل نہیں کر سکتا' جس طرح کہ وہ ترک معیشت میں پیدا کردہ بدنظمی کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ ترکی کا استحکام اور خوشحالی مغرب کے مفاد میں ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں اندر سے ہی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تاہم مغرب کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ صورت حال کا ادراک کرے۔ اسے اپنے اصولوں کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کرد مسئلے کی طرح نسلی تنازعات کا کوئی آسان حل نہیں ہے۔ مغرب کے لیے یہ سمجھنا بھی مفید ہو گا کہ سیکولر ازم اور اسلام یعنی مغرب اور مشرق کے درمیان نظریاتی کشمکش میں سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کا بڑا عمل دخل ہے اور دوسری جگہوں کی طرح ترکی میں سیاست جزوی طور پر ایک اچھی زندگی کے وژن پر محیط ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ فوری، مادی ضروریات کی تکمیل یا دوسرے لفظوں میں بہتر معیشت سے عبارت ہے' جس کی ترکوں کی اکثریت کو طلب ہے اور اسی کی ہمیں بھی ہے۔ یعنی ایک پرامن اور آرام دہ زندگی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مغرب اپنے غیر حقیقی اہداف کی پیروی کرنا چھوڑ دے۔

قبرص کا سوال

ترکی میں برسراقتدار اسلام پسند یونانیوں اور آرمینیوں سے جبلی طور پر نفرت کرتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں بطور نائب وزیر اعظم اربکان پورے قبرص پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۹۵ء کی انتخابی مہم میں انہوں نے برطانیہ' فرانس' امریکہ اور ترکی کی طرف سے عراقی کردوں کے تحفظ کے لیے شروع کی گئی کارروائی کے بارے میں یہ عجیب الزام لگایا کہ اس کا مقصد ایک عظیم تر آرمینیا کو وجود میں لانا ہے۔ جیسے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران زیر تسلط فلسطین میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اربکان یونان اور آرمینیا کے بارے میں مغربی دباؤ کے تحت نرم رویہ اختیار کرنے کے تاثر کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ تاہم ان کے حمایتی ان سے اس بات کی توقع بھی نہیں رکھتے کہ وہ ان کی مادی خوشحالی کی قیمت پر مفت میں جارحانہ یا سرگرم رویہ اختیار کریں۔

اربکان کے اقتدار میں آنے سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ ترکی ایک توسیع پسند ملک نہیں ہے۔ ترک عوام کی اکثریت کو ذاتی اور اجتماعی اقتصادی ترقی میں دلچسپی ہے۔ بوسنیائی اور چیچن مسلمانوں کی حالت زار سے ان میں ہمدردی کے جذبات ضرور بیدار ہوئے' لیکن بمشکل ہی چند ترکوں نے ان کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی طرح افغانستان اور فلسطینیوں کی صفوں میں (سوائے بائیں بازو کے بعض انقلابی افراد کے) کسی ترک رضا کار کا وجود نہیں ملتا۔ ترک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کی اکثریت کی نظر میں خیرات گھر سے شروع ہو کر گھر پر ہی ختم ہوتی ہے۔

اسلام اور ریا مغرب

ترکی میں لادین حزب اختلاف اربکان پر الزام لگاتی ہے کہ وہ اسلامی مشترکہ محاذ کے خواب کی پیروی میں مغرب کے ساتھ پرانے تعلقات کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ حقیقت میں اربکان کی نظر میں ان کی اسلامی پالیسی مغرب' ناٹو' امریکہ کے ساتھ دو طرفہ دفاعی تعاون اور یورپی یونین میں ایسوسی ایٹ ممبر شپ کی پالیسی کے متبادل نہیں' بلکہ اس میں ایک نیا اضافہ ہے۔ تاہم چاہے اربکان ترک خارجہ پالیسی کے جوہر کو تبدیل نہ بھی کریں' اس کے باوجود سٹائل اور پیشکش کی بہت اہمیت ہے۔ اربکان کی نعرہ بازی پر مشتمل سفارتکاری' ان ممالک کے ساتھ' جن سے ان کے قریبی تعلقات ہیں' ترکی کے اعتبار کو مجروح کر سکتی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ترکی کی برآمدات کا ۶۱ فیصد او ای سی ڈی (اس میں ۵۱ فیصد یورپی یونین) کے ملکوں کو گیا۔ جبکہ ان ملکوں سے درآمدات کا تناسب (بشمول ۴۷ فیصد یورپی یونین کے ملکوں سے) ۶۶ فیصد تھا۔ غیر ملکی سرمایہ کاری' قرض' ٹیکنالوجی اور سیاحوں کی اکثریت کے لیے ترکی کا او ای سی ڈی میں شامل امیر ملکوں پر بہت انحصار ہے۔

اربکان کی خارجہ پالیسی میں "اسلامی عنصر" بلند ایجوت کی خارجہ پالیسی کی بازگشت ہے' جس کا تعارف انہوں نے ۱۹۷۹ء میں اپنے وزارت عظمیٰ کے دور میں کروایا تھا۔ ترک جمہوریہ کی خارجہ پالیسی ہمیشہ قومی مفاد کے سنجیدہ جائزے پر مشتمل رہی ہے۔ عراق میں صدام حسین کے ذاتی مفاد کے گرد خارجہ پالیسی گھومتی ہے۔ شام میں حافظ الاسد کی ذاتی دلچسپی اور ایران میں مسلم علماء کے گروہی مفاد کے تحت ملکی اور خارجہ پالیسی استوار ہو پاتی ہے۔ جبکہ ترکی میں سیاستدانوں اور ان کے انتخابی حلقوں کے گروہی مفادات داخلی معاملات پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں' لیکن خارجی امور ان کے ذاتی و گروہی مفادات سے محفوظ رہتے ہیں۔ ترکی کی خارجہ پالیسی عالمی صورت حال کے مطابق بتدریج تبدیل ہوتی ہے اور اس کے لیے مذاکرات میں متفرق حکمت عملی کی تکنیکیں اختیار کی جاتی ہیں۔ تاہم اس میں کسی قسم کی مہم جوئی سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

اس تناظر میں مغرب ترکی کے ساتھ کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ اس میں سودے بازی بالعموم سخت ہوتی ہے۔ لیکن اختتام پر مشترکہ مفاد کسی مفاہمت پر منتج ہوتا ہے۔ اربکان کی یہ سوچ بجا نہیں کہ وہ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ سخت سودے باز ہیں۔ لیکن وہ مغرب کے ساتھ مفاہمت کے اتنے ہی خواہشمند ہیں' جتنے کہ ان کے سیاسی حریف ہیں۔ اربکان اقتدار میں رہتے ہیں یا نہیں' وہ ترکی اور مغرب کے مابین مشترکہ مفادات کے تقاضوں کی حد تک تعاون جاری رکھیں گے اور مشترکہ مفاد کا

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

© rasailojaraid.com